ارمان نجمی (پٹنہ)

# انور سدید
# ایک بے تکان مایہ ناز قلم کش

قلمِ گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بہ دولت می رسانم

انور سدید نے قلم کے ذریعہ دولت تو نہیں کمائی لیکن اس کے ذریعہ رزق حلال ضرور حاصل کیا بنیادی طور پر وہ سائنس کے آدمی تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے انجینئر اس کا اردو متبادل مہندس قبولِ عام نہ حاصل کر سکا لیکن میں ان کے مہندس ہونے کو نیک فال سمجھتا ہوں کہ اس کی تعلیم نے ان کی ذہنی ساخت و پرداخت کو ایسی جہت عطا کی جس پر چل کر وہ تجزیہ و تحلیل کے ماہر ہو گئے اور لفظوں کی تشکیل اور ردِ تشکیل کے طور طریقے سے ایسے واقف ہو گئے جیسے وہ اسی کام کے لیے ہی بنے ہوں۔ اپنی ابتدائی زندگی میں انھوں نے افسانے ضرور لکھے لیکن اس میدان میں اپنی آمد کی چھاپ چھوڑ کر پیشہ ورانہ مصروفیت کے مطالبات سے انصاف کرنے لگے وہ خود لکھتے ہیں ''ارباب علم جانتے ہیں کہ انجینئرنگ کے ایک عملی شعبے سے متعلق ہوں۔ تاہم ادب میرا جز وقتی شغل نہیں بلکہ میرا عشق ہے۔ میں نے زیرِ نظر مقالے کو عشق کے اس جذبے سے تکمیل تک پہنچایا ہے جو بیان میں نہیں آ سکتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس طویل سیاحت کے دوران ہر نئے انکشاف نے مجھے روحانی مسرت دی اس نہایت سے ہم کنار کیا جس کے سامنے ہر انعام ہیچ ہے''

(پیش لفظ اردو ادب کی تحریکیں، ص ۲۲، کتابی دنیا، نئی دہلی ۲۰۰۴)

ان کے اندر جو شاعر ادیب اور تنقید نگار چھپا بیٹھا تھا وہ مناسب محل اور موقع پاتے ہی اپنے قلم کے جوہر دکھا کر اہلِ نظر کی کتاب سمیٹنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ تو وزیر آغا سے پہلے بھی ملتے رہے تھے لیکن ۱۹۶۴ء میں جب وہ سرگودھا میں منتقل ہوئے تو ان کی اور وزیر آغا کی ملاقاتوں میں ایک تسلسل آ گیا کہ وزیر آغا بھی ان دنوں سرگودھا (ریلوے روڈ) میں ایک مکان خرید کر اس میں قیام پذیر ہو چکے تھے جہاں شامِ دوستاں آباد ہونے لگی تھی۔ وزیر آغا اس وقت تک نصرت آرا کے نام سے اپنی شعری کاوشیں اور نصیر آغا کے

نام سے اپنی نثری تحریریں چھپوانا بند کر کے اپنے حقیقی نام سے ہی ادبی دنیا میں امتیاز حاصل کر چکے تھے۔ ان دنوں اعجاز فاروقی، عارف عبدالمتین، ڈاکٹر غلام جیلانی اصغر، جمیل ملک، نثار ناسک، احمد شہزاد جیسے ذہین و فطین ادب نوازوں سے ان کے مراسم ہو چلے تھے۔ ادبی مسئلوں پر تبادلۂ خیال اور گرما گرم مباحث کے مالۂ و ماعلیہ کے نادیدہ ناشنیدہ معاملات ان کے ادراک کی کائنات کو وسعت پذیر کر رہے تھے۔ اس طرح انور سدید اپنی تخلیقیت کے نئے مدار میں داخل ہو گئے۔

اسی جذبے نے ان سے اردو زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم، بی۔ اے آنرس، ایم۔ اے کے میدان میں اپنی فتوحات کا علم بلند کرایا اور وہ امتیاز اور طلائی تمغوں کے ساتھ کامیاب طلبا میں سرِ فہرست رہے۔ اس درمیان وہ تخلیقی ادب کی دانش افروزی اور صحافتی ادب کی ہمہ جہتی کے راستے طے کرتے ہوئے تنقیدی مضامین، اور کتابوں پر سیر حاصل تبصرے بھی لکھتے رہے۔ ورنہ ایک برسرِ کار انجینئر کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اردو میں پی ایچ ۔ڈی کا ڈول ڈالے ایک ایسا مشکل موضوع چن کر محنتِ شاقہ اور شب بے داریوں کے مسلسل انہماک سے گزر کر برسوں کی ریاضت کا ثمرہ پیش کر کے تحقیق و تنقید کا ایک نیا معیار قائم کرے۔ ''اردو ادب کی تحریکیں'' کسی بنے بنائے سانچے میں نہیں ڈھالی گئی بلکہ واقعات و شواہد کے غیر جانب دارانہ اور ذاتی نتائج خیزی کے بعد ہی لکھی گئی۔ اس کا اوّلین خاکہ ۱۹۶۶ء میں ''اردو ادب میں چند فکری تحریکیں'' کی غیر معمولی پذیرائی کے بعد ترتیب دیا گیا اور سات آٹھ برسوں تک وہ اس پر مواد اکٹھا کرتے رہے اور آہستہ آہستہ اپنا مقالہ لکھتے رہے۔ اس کے منتشر اوراق کی تالیف میں بھی ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۶ء تین برس لگے، تب جا کر اس کے نسخے کو پنجاب یونی ورسٹی سے پی ایچ ۔ڈی کی منظوری مل سکی۔ غور و فکر کی لہریں مرکوز خیال، حسن معنیٰ اور سادہ اسلوب کی نئی صورت پیدا کر کے انھوں نے نہ صرف اپنے معاصروں کو متاثر کیا بلکہ آئندگان کے لیے بھی اعلیٰ مثال قائم کر دی۔

اس قاموسی تحقیق نامہ کے ابواب میں جن تحریکوں کا تذکرہ ہے وہ ۱۹۷۵ء تک ہی محیط ہیں، اس کی کئی مکرر اشاعتیں تو ہوئیں لیکن ۱۹۷۵ء کے ادبی ذہن سازی کے متعلق کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ ۲۰۰۴ء میں اس کی اشاعت میں حرفے چند کے زیرِ عنوان جمیل الدین عالی نے اس کی جانب توجہ دلائی ہے کہ'' ۱۹۷۵ء کے بعد جہاں یہ تاریخ ختم ہو جاتی ہے اردو ادب میں کوئی بڑی تحریک چلتی نظر نہیں آتی پھر بھی عالمی ادب میں ایسے رجحانات نے ضرور سر ابھارا ہے جن کے اثرات اردو ادب پر بھی پڑے ہیں۔ وہ رجحانات ''مختصر لفظوں میں پس جدیدیت ساختیات اور پس ساختیات ہیں'' (جمیل الدین عالی، حرفِ چند، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۱۱، دہلی)

انھوں نے پس نوآبادیاتی مطالعات کا ذکر نہیں کیا نہ ہی مصنف کی موت اور پھر تاریخ کی موت کا کوئی بیان کیا حالاں کہ گذشتہ دنوں متن اور بیانیے کے کئی نئے زاویے سامنے آئے ہیں۔

اس کتاب کے اختتامیہ میں پوری انسانی تہذیب وثقافت کی تاریخ کا جمالیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ یونان، روم، جرمنی، فرانس اور انگلستان کے مفکروں اور دانشوروں کے عطایئے کا بیان بھی ہے ہیئت اور مواد کے مباحث کو بھی سمیٹا گیا ہے اور ہندوستان میں آریاؤں کی آمد اور دراوڑیوں سے ان کی آویزش و آمیزش قدیم ہندستانی فلسفے اور دیومالاؤں میں انسانی فکر کے ابتدائی نقوش سے لے کر اپنیشد اور ویدوں پرانوں کے ایک ہزار سال قبل مسیح اور اپنشدوں آٹھویں صدی ق م تک کے وجود پذیر روحانی اور مادّی کش مکش کو پیش کر کے اور مہابھارت اور رامائن دونوں رزمیے کے ذکر سے پورے دور کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ساتھ ہی ہندستان میں بودھ اور جین مذاہب کے خلاف شنکراچاریہ کی کوششوں سے ان کے اثرات زائل کرنے بلکہ ان کے بیخ کنی کے مختصر بیانیہ، اور پھر اس خطے میں دینِ اسلام کی آمد، اسلامی مملکت کا قیام اور اس کے دور رس نتائج کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔فرقہ وارانہ تعصبات کے ساتھ ذات پات کی بنیاد پر معاشرے کی تقسیم اور انسانوں یا انسانیت کی تذلیل و تحقیق کو بھی موضوع کے دائرے میں سمیٹ کر شعور اور لا شعور کی گتھیوں کے الجھاوے کو بھی اوجھل نہیں ہونے دیا ہے اور اردو زبان کی ابتدائی شکل ریختہ اس کی اصلی شکل میں پیش کر کے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کی حیثیت سے مشتہر ہونے اور اس کے مقبولِ عام ہونے کی مخالفت اور دیوناگری رسمِ خط کے ذریعے ایک نئے لسانی نظام کی ترغیب کا بھی ذکر کیا ہے اور اسی تصادم کے باعث اور گنگا جمنی تہذیب کی مخالفت کے نتیجے میں ملک کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ یہاں انھوں نے نہ تو ہندی ساہتیہ سمیلن، الٰہ آباد (قائم شدہ ۱۹۱۰ء) اور نہ ہی دیوناگری پرچارنی سبھا، بنارس (قائم شدہ ۱۸۸۴ء) کا نام لیا ہے۔ یہ حصہ کچھ اور تفصیل کا طالب تھا جس میں امرت رائے اور گیا چند جین کی کتابوں کے مشمولات سے بحث ومباحثہ کا باب کھل جاتا۔

ان کی کتابوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ماخذات اور حوالہ جات کی نئی علمی روایت کو آگے بڑھا کر اپنی تصانیف کے آخر میں ان کی مکمل فہرست ہی نہیں مہیا کر دی بلکہ مقالات اور کتابوں کے الگ الگ عنوان مقرر کیے اور تمام اشخاص کا اشاریہ بھی پیش کر دیا جن کا ذکر ان کے صفحات کی زینت بنا ہے اس طرح جدید اصول کی پیروی کر کے انھوں نے اپنے طرزِ نگارش کو بے وزن ہونے سے بچا کر اس کی اہمیت میں چار چاند لگایا ہے۔

زبان اور انسانی تہذیب وثقافت کے اس تفصیلی مطالعہ نے ان کی ایک اور معرکۃ الآرا تصنیف

''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' کے لیے ہی راہ ہموار کی۔ گر چہ اس کو مہمیز ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب'' اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے کچھ اقتباسات اور پھر ان کے حذف کرنے کے متنازعہ فیہ اقدامات نے لگائی۔ سلیم اختر نے سرگودھا اسکول اور وزیر آغا کی ادبی اور علمی حیثیت پر گرد لگا کر انور سدید کو اس بھاری پتھر کے چومنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ان کی یہ قاموسی نوعیت کی دوسری اہمتصنیف کی داغ بیل پڑی اور اس میں جو ابواب اور ذیلی معالعہ کے فصل قائم کیے گئے وہ اسے ایک مکمل اور جامع تاریخ کا درجہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ میں یہ بات اتنے وثوق سے اس لیے کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ''اردو ادب کی تحریکیں'' اور''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' دونوں کے بیشتر ماخذات اور حوالاجات اور اشخاص کی تفصیلات میں بہت کچھ مشترک ہے۔ اس تاریخ کی کتاب میں انھوں نے جو عنوانات قائم کیے وہ بھی ان کی طبّاعی اور نئے فکری میلان کی کونشان زد کرتے ہیں۔ رپورتاژ، سفرنامے، خودنوشت اور تنقید و تحقیق کی مختلف نوعیتوں کو الگ الگ خانوں میں رکھ کر ان کے امتیازات کو درشایا ہے۔ اور انشائیہ کا ایک نیا باب بھی شامل کیا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ خود بھی انشائیہ لکھتے رہے ہیں اور وزیر آغا سے مل کر''اوراق'' کا انشائیہ نمبر بھی ترتیب دے چکے ہیں۔ جس میں انگریزی زبان کے انشائیہ نگاروں (Light sessayists) جیسے مونتان فرانسس بکن، چارلس لیمب اور ویلیم ہیزلیٹ کے انشائیوں کے تراجم بھی شامل ہیں اور ایک سیر حاصل پیش لفظ بھی ہے جس کے ذریعے اس صنف کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں تکرار سے بچنے کے لیے اس موضوع کو دہرانا نہیں چاہتا لیکن ان کے انشائیوں کا مجموعہ بھی 'ذکر اس پری وش کا' (۱۹۸۹ء) اور' آسمان پر پتنگیں' (۱۹۹۴ء) کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اور انشائیوں پر ان کی ایک مبسوط اور معیاری کتاب بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔ ان تمام ذہنی کاوشوں کا نتیجہ یہ ہے کہ انشائیہ کیا نہیں ہے کے ساتھ انشائیہ کیا ہے کا شناخت نامہ بھی وجود میں آ چکا ہے۔ اس کے دامن میں طنز و مزاح کے متعلقات براہِ راست جگہ نہیں بناتے ہیں۔ سبک طنز اور لطیف مزاح کی شگفتہ لہر جو موضوع کو پھول کی طرح مسکرانے پر مائل کرتی ہے، اس صنف کی ایک ایسی خاصیت ہے جسے وزیر آغا سمیت ان کے ہم نشینوں اور بعد کی نسلوں کے انشائیہ نگاروں نے کامیابی سے برتا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید احمد صدیقی، امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، ممتاز مفتی، کنھیا لال کپور، مشتاق یوسفی اور فکر تونسوی کے مضامین انشائیہ کے تحت شمار نہیں ہو سکتے۔ مشتاق یوسفی کی تحریریں انشائیہ کی ایک ذیلی شاخ ہے۔

خاکہ نگاری بھی نثر کی ایک ایسی جدید صنف ہے جس کے امکانات دن بہ دن روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ معیاری بلکہ مثالی خاکوں کی کئی کامیاب کتابیں منظر عام پر آ کر پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن

چکی ہیں ۔اس صنف کو بھی کچھ لکھاریوں نے اس طرح برتا ہے کہ یہ خاکہ نہ ہو کر شخصیت یا سیرت نگاری کے ذیل میں آ جاتی ہے انور سدید کو یہ صورتِ حال بالکل گوارا نہیں ہے اس لیے انھوں نے ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''میں اسے سوانحی ادب ،سوانح نگاری (خودنوشت سمیت) قلمی خاکے اور کردر نگاری اور یادنگاری سے الگ اور بالکل مختلف نئی اور مکمل صنف کی حیثیت بخشی ہے۔وہ خود اس باب کی ابتدا میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے قلمی خاکے''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی'' سے کرتے ہیں۔کچھ حالیہ محققین اس کا آغاز کچھ ناولوں کے کرداروں سے منسوب کرتے ہیں جیسے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ (انور سدید) قلمی خاکے کے تحت لکھتے ہیں'' خاکہ فنی لحاظ سے شخصیت نگاری کی ذیل میں آتا ہے یہ سوانح کی مشکل ترین صورت ہے۔خاکہ پنسل اسکیچ کی طرح محض ٹیڑھی بیکی لکیروں کا مجموعہ اور اندر سے کھوکھلا نہیں ہوتا بلکہ اس میں مشاہدے کے حقیقی گوشے،شگفتہ اسلوب میں پیش کیے جاتے اور کردار کا بامعنیٰ اور مثبت تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمدردی،مردم شناسی،واقعیت اور نفسیاتی آگہی اچھے خاکہ نگار کے بنیادی اوصاف شمار ہوتے ہیں۔یعنی خاکے کا مقصد شخصیت کی متوازن عکاسی تہذیبی حقائق کا انکشاف اور شخصی تاثر کی فنکارانہ پیش کش ہے۔''(اردو ادب کی مختصر تاریخ،ص ۶۲۰)

سطور بالا کو رقم کرتے ہوئے ان کے ذہن میں اس صنف کی بوطیقا (Poetics) مرتب کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔شیخ سعدی نے ایک بڑے مزے کی بات کہی ہے:

نے مفکر بود نہ دانش مند    چار پائے برو کتابِ چند

انور سدید کسی موضوع کو مس کر کے یا اس پر ایک نظر ہی ڈال کر چھوڑ نہیں دیتے بلکہ مسلسل غور و خوض کر کے اس کی حدود اور وسعتوں یا افقی اور عمودی خطوط کو نمایاں کرنے کی بھی کوشش سے باز نہیں آتے انھوں نے خاکہ نگاری کی صنف کی بوطیقا طے کرنے کے سلسلے میں کئی اہلِ علم ونظر سے رابطہ کر کے ان کا جواب لکھا ہے ۔ڈاکٹر انور سدید کی''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' کا صرف ایک سرسری موازنہ ڈاکٹر اعجاز حسین کی تصنیف اردو ادب کی تاریخ مکتوبہ ۱۹۳۸ء؟ سے کر کے دیکھیے تو بہت ساری باتیں سامنے آتی ہیں۔ میں صرف نئے نثری اصناف کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں سطور بالا کے تفصیلی مطالعے سے ظاہر ہے کہ ایک زندہ زبان ایک شجرِ بارآور کی طرح پھلتی پھُلتی ہی نہیں رہتی ہے بلکہ اس میں نئی شاخیں بھی پھوٹتی ہیں۔جن کی بہاریں تقلیبِ رنگ وآہنگ کو نشان زد کرتی ہیں۔اور جو اپنے مضبوط تنے سے وابستہ رہ کر نئی بلندیوں اور نئی فضاؤں کی جانب پرَ فشاں ہوتی ہیں اور کبھی کبھی شاخیں زمین کی جانب نئی جڑیں بھی پھینکتی ہیں اور زمین سے استوار رشتے کو اور بھی استوار کرنا چاہتی ہیں۔☆☆☆

جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۴ امراوتی، مہاراشٹر (ہند) اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء

**سرپرست** : جناب منور پیر بھائی (پونہ)

مدیر

وسیم فرحتؔ (علیگ)

Email:wkfarhat@gmail.com Cell.09370222321

نائب مدیران: کلیم ضیاؔ، احسن ایوبی

**مشیر**

شمیم فرحتؔ

| | |
|---|---|
| شمارۂ ہٰذا | ۱۰۰ روپے |
| لائبریری اور اداروں سے | ۲۵۰ روپے |
| لائف ممبر شپ | ۵۰۰۰ روپے |
| یورپی ممالک کیلئے | ۱۲ امریکی ڈالر |
| برطانوی ممالک کیلئے | ۱۶ پاؤنڈ |
| پاکستان کیلئے | ۹۰۰ ہندوستانی روپے |
| خلیجی ممالک کیلئے | ۹۰۰ ہندوستانی روپے |

**خط و کتابت کے لیے:**

Waseem Farhat (Alig)
Post Box No.55, H. O,
AMRAVATI-444601(M.S)INDIA

**صرف زرِ سالانہ اور رجسٹری ڈاک کے لیے:**

The Editor,URDU,
"Adabistan", Near Wahed Khan
UrduD.Ed.College, Walgaon Road,
AMRAVATI-444601,Maharashtra (India)

**پاکستانی خریداروں کا صرف زرِ سالانہ بھجوانے کیلئے:**

بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان
B/18-II، کمرشل ایریا، نزد سپر ایشیا بیکری، ناظم آباد، کراچی
موبائل:0321-8291908

اگر آپ چیک یا ڈرافٹ بھیجنا چاہیں تو صرف SEHMAHEE URDU اس نام سے بھیجیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں اور کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی صرف امراوتی عدالت میں ہی کی جائیگی۔